USWA JOURNAL OF RESEAR اُسوہ مجلہ تحقیق
Volume, 05, Issue: 01 (Jan- Jun 2025)
e-ISSN:2790-5535 p-ISSN:2958-0927
Website: https://uswa.com.pk/

استعارے کی تخلیق، اطلاق اور معنوی امکانات

Creation, Application, and Semantic Possibilities of Metaphor

Dr Arif Hussain
Lecturer Department of Urdu, Boys Degree College Skardu
Email: Arif28106@gmail.com

Abstract

This paper examines the creation, significance, utility, application, and semantic possibilities of metaphor in literary and cognitive discourse. As a fundamental device of figurative language, metaphor transcends mere ornamental function to serve as a vital mechanism for conceptual expansion and aesthetic expression. The study explores how metaphors are generated through imaginative processes, their role in shaping thought and communication, and their enduring relevance across linguistic and cultural contexts. By analyzing metaphor's structural and functional dimensions, the paper highlights its capacity to encode complex ideas, sustain semantic evolution, and facilitate deeper intellectual and spiritual engagement. Furthermore, the research investigates the applicability of metaphor in diverse fields-from literature and philosophy to everyday language-demonstrating its universal utility as a tool for meaning-making. Ultimately, this article underscores metaphor's transformative potential, revealing how it not only enriches language but also opens new interpretive horizons, enabling fresh perspectives on reality and human experience.

***Keywords**: Creation, Application, Semantic, metaphor, language, aesthetic expression*

استعارہ کی لغوی اور اصطلاحی تعریف:

استعارہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کا مادہ اصلی "ع ی ر" ہے۔ عربی میں علمِ صرف کے مطابق سہ حرفی، چہار حرفی افعال کے کئی ابواب ہیں جیسے باب افعال، تفعیل، مفاعلہ اور استفعال وغیرہ۔ ایک فعل کو جس باب میں لے جایا جائے گا اسی اعتبار سے معنی میں تبدیلی آتا جائے گا مثلاً ضرب یعنی اس ایک نے مارا، "تضارب" ان دونے ایک دوسرے کو مارا اسی طرح "فہم" اس نے سمجھا اگر اسی کو باب استفعال میں لے جائے گا تو طلب کا معنی دے گا "استفہام" یعنی اس نے سمجھنے کے لیے سوال کیا اسی قاعدے کی رو سے "ع ی ر" کو باب استفعال میں لے کر جائے تو حرف علہ کو گرانے اور 'آخر میں "تاء مصدر" کے لگانے سے "استعارۃ" بنا۔ وقف کی صورت میں استعارہ پڑھا جاتا ہے البتہ اردو میں استعارہ شہرت پا گیا

ہے۔ پس کسی سے کوئی چیز ادھار یا عاریہ کے طور پر مانگنا استعارہ کہلاتا ہے اردو لغت نویسوں نے بھی الفاظ میں تبدیلی کے ساتھ اسی معنی کو ضبط تحریر میں لایا ہے۔

اردو لغت "(تاریخی اصولوں پر) میں رقمطراز ہیں کہ "مستعار لینا، عارضی طور پر مانگنا، بیان لفظ کا مجازی معنی میں استعمال جبکہ حقیقی اور مجازی معنی میں تشبیہ کا علاقہ ہو، مشبہ سے مشبہ بہ مراد لینا، جیسے شیر مشبہ بہ بول کر مرد شجاع مشبہ مراد لیا جائے۔(۱)

درسی اردو لغت" میں مرقوم ہے" ادھار مانگنا، کسی لفظ کو ااصلی معنی کی بجائے کسی اور معنی میں استعمال کرنا جبکہ ان دونوں میں تشبیہ کا تعلق ہو۔۔ مثلاماں بچے کو چاند کہہ دے تو استعارہ ہے(۲)

فرہنگ آصفیہ میں مولوی سید احمد دہلوی لکھتے ہیں: مانگ لینا، علم بیان کی اصطلاح میں مجاز کی ایک قسم ہے یعنی جب مضاف الیہ کو مضاف سے کچھ تشبیہ کا لگاؤ ہو تو اس مضاف کو استعارہ کہتے ہیں۔(۳)

فرہنگ تلفظ میں شان الحق حقی لکھتے ہیں کہ" تشبیہ بلا حرف تشبیہ، لفظ کے اصلی معنی کی بجائے مجازی معنی مرادلینام: گل سے مراد محبوب، کان جوہر سے مراد خوبیوں بھرا آدمی۔(۴)

مہذب اللغات" میں مرقوم ہے کہ" استعارہ (بکسر اول و سوم، فتح ششم) کسی چیز کا عاریتامانگنا، علم بیان کی اصطلاح میں حقیقی اور مجازی معنوں کے درمیان تشبیہ کا علاقہ ہونا، یعنی معنی حقیقی کا لباس مجازی معنوں کو عاریتامانگ کے پہنانا۔(۵)

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو تمام اہل لغت نے استعارہ کو عاریہ اور ادھار کے معنی میں لیے ہیں۔ جب یہ لفظ علم بیان میں درآیا تو یہ اپنا ایک الگ معنی اور تشخص قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا علم بیان کے دو بنیادی ارکان میں سے ایک مجاز ہے اور مجاز کی کئی اقسام ہیں ان میں تشبیہ، مجاز مرسل، کنایہ اور استعارہ قابل ذکر ہیں استعارہ وہ لفظ ہے جو اپنے اصلی، عرفی اور وضعی معنی سے ہٹ کر دیگر معانی میں مشابہت اور مناسبت کی بنا پر مستعمل ہو اس اجمال کی وضاحت میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ عام طور پر انسان افہام و تفہیم کے لیے زبان کا سہارا لیتا ہے اور زبان معانی کی ترسیل اور افہام و تفہیم کے لیے الفاظ کا سہارا لیتی ہے کبھی الفاظ اپنے اصلی معنی میں استعمال ہوتا ہے تو کبھی غیر کے معنی میں پس جب لفظ اپنے حقیقی معنی کے بجائے مشابہت کی موجودگی میں حرف تشبیہ کے بغیر دیگر معنی میں استعمال ہو جائے تو یہ استعارہ کی دنیا ہے۔

استعارہ مشرقی شعریات کی دین ہے عربستان سے ہو کر فارس کے راستوں سے یہ اصطلاح برصغیر میں آپہنچی جہاں اردو نے اس کا خیر مقدم کیا اور اردو ادب کی ایک اہم تنقیدی اصطلاح بن کر اُبھری اا اردو ادب کے بیشتر خاص کر قیام پاکستان سے قبل کے نقادوں نے استعارہ کی عربی اصطلاح کو منہ وعنہ اردو میں ترجمے پر اکتفا کیا' البتہ کئی اہم نقاد نے اپنے تجربات و تصورات کو شامل کر کے اضافات بھی کیے ہیں۔

صاحب مختصر المعانی لکھتے ہیں:

"الاستعاره هی اللفظ المستعمل فی ما شبه بمعناه الاصلی لعلاقه المشابهه کاسد فی قولنا رایت اسدا یرمی(٦)

احمد ہاشمی جواہر البلاغہ میں لکھتے ہیں"استعمال اللفظ فی غیر ما وضع له فی اصطلاح التخاطب لعلاقه المشابهه مع قرینه صارفه عن اراده المعنی الاصلی(٧)

آرچی بالڈ میکلش لکھتے ہیں:

Metaphor is the supreme agent by which disparate and wither to unconnected things are brought together in poetry (8)

آکسفورڈ ایڈوانس لیئرنینگ ڈکشنری میں مرقوم ہے

(a)The imaginative use of a word or phrase to describe sb/sth as another object in order to show that they have the same qualities and to make the description more forceful, e.g. She has a heart of stone: striking originality in her use of metaphor
(b)an example of this: a game of football used as a metaphor for the competitive struggle of life, Compare SMAIL (9)

سید عابد علی عابد اپنی کتاب "البیان" میں لکھتے ہیں:

وہ لفظ جو غیر وضع معنوں میں استعمال ہو اور حقیقی و مجازی معنوں میں تشبیہ کا علاقہ ہو' نیز مشبہ یا مشبہ بہ کو حذف کر کے ایک دوسرے کی جگہ استعمال کرتے ہیں لیکن کوئی ایسا قرینہ بھی ساتھ ظاہر کرتے ہیں جس سے معلوم ہو جائے کہ متکلم کی مراد حقیقی معنوں کی نہیں ہے معنی مشبہ بہ کو مستعار (مانگا ہوا اس کے واسطے) معنی مشبہ کو مستعار (مانگا ہوا اس سے) اس لفظ کو جو مشبہ بہ کے معنی پر دلالت کرے مستعار۔ وجہ مشبہ کو وجہ جامع کہتے ہیں۔(۱۰)

استعارہ دراصل مجاز کی ایک قسم ہے جس میں لفظ اپنے لغوی معنی کو ترک کر کے لسانی سیاق و سباق کے اعتبار سے نئے معنی مستعار لیتا ہے یا یوں کہ انہیں آگے بڑھاتا ہے، معنی کی وضاحت اور شدت کے لیے استعارہ سے اہم کوئی طریقہ نہیں۔

پروفیسر ممتاز حسین اور عبدالرحمٰن بجنوری کے ہاں استعارہ تبدیل حقیقت کے دعوے کا نام ہے اور تبدیلی بھی صوری نہیں بلکہ معنوی۔ جیسے جب بیٹا باہر سے آتا ہے تو ماں کہتی ہے وہ دیکھو میرا چاند آرہا ہے اس مثال میں بیٹا اور چاند دو الگ الگ معنی کے حامل الفاظ ہیں لیکن ایک قدر مشترک ان کے درمیان موجود ہے وہ دونوں کی خوبصورتی ہے پس یہاں بیٹے کو چاند بتایا اور تبدیل حقیقت کا ایک گونا دعویٰ بھی ہے لہٰذا یہ استعارہ ہے جیسا کہ عبدالرحمٰن بجنوری کا یہی خیال ہے کہ "تشبیہ صرف حقیقت کو چمکا کر ختم ہوتی ہے اور استعارہ اس سے آگے بڑھتا ہے اور ایک چیز کو دوسری کا لباس بنتا ہے اور تبدیل صورت سے تبدیل حقیقت کا دعوی کرتا ہے"(۱۱)

بجنوری کی مذکورہ تعریف سے ہٹ کر محمد حسن عسکری ایک الگ نوعیت کی تعریف کرتے دکھائی دیتے ہیں وہ انسان کی زبان سے نکلنے والے الفاظ اور اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر زبان کو بھی استعارہ سے عبارت جانتے ہیں۔ حسن عسکری لکھتے ہیں:

استعارہ تو انسانی تجربے کی نسلوں سے رستا ہے۔۔۔ ہمارا ایک ایک فقرہ استعارہ ہوتا ہے استعارہ سے الگ "اصل زبان" کوئی چیز نہیں کیونکہ زبان خود استعارہ ہے' چونکہ زبان اندرونی تجربے اور خارجی اشیا کے درمیان مناسبت اور مطابقت ڈھونڈنے یا خارجی اشیا کو اندرونی تجربے کا قائم مقام بنانے کی کوشش سے پیدا ہوتی ہے اس لیے تقریباً ہر لفظ ہی ایک مردہ استعارہ ہے(۱۲)

انیس ناگی استعارہ کو عربی شعریت کی دین سمجھتا ہے لیکن ان کی بیان کردہ تعریفات سے ہٹ کر ایک ابتکاری تعریف اس انداز میں کرتے ہیں: اردو کی تنقیدی لغت' صرف و نحو' اور علم و بیان میں استعارہ کا مروجہ تصور ناقص اور غیر تسلی بخش ہے۔۔۔ استعارہ کی کوئی ایسی تعریف وضع کرنے کی ضرورت ہے جسے استعارہ کے قطعی تصور کی تشکیل میں بطور مفروضہ استعمال کر کے بعض تنقیدی مغالطوں کو دور کیا جا سکے۔۔۔ استعارہ سے مراد الفاظ کی دلالت غیر وضعی ہے ہر لفظ کسی شے سے مختص ہوتا ہے جب ایک لفظ کو اس شے کے لیے استعمال کیا جائے جس کے لیے وہ اساسی طور پر وضع نہ کیا گیا ہو تو اسے استعارہ سے تعبیر کرتے ہیں۔(۱۳)

ارسطو کے نزدیک استعارہ نابغہ روزگار ہی تخلیق کر سکتا ہے کی روشنی میں شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

ہمارے ہاں یہ خیال شروع ہی سے عام رہا ہے کہ استعارہ شاعری کا جوہر ہے' اس لیے استعارے کو صنعتوں کی فہرست میں نہیں رکھا بلکہ اس کا مطالعہ علم بیان کی ضمن میں کیا گیا' کہ استعارہ وہ طریقہ ہے جس کے ذریعے ہم ایک ہی معنی کو کئی طریقے سے بیان کر سکتے ہیں۔۔ ظاہر ہے کہ اس پر قدرت ہونا سب صلاحیتوں سے بڑھ کر ہے یہ نابغہ کی علامت ہے کیونکہ استعاروں کی خوبی سے استعمال کرنے کی لیاقت مشابہتوں کو محسوس کر لینے کی قوت پر دلالت کرتی ہے(۱۴)

استعارہ کی تخلیق کے لیے ایک خلاقانہ ذہنیت درکار ہوتی ہے۔ جس کی قوت تخیل جتنی بلند ہو گی اسی حساب سے مشابہتوں کے نتیجے میں استعارہ اپنا ہنر دکھاتا ہے۔لہذا جب شاعر کسی استعارہ کی تخلیق کرتا ہے تو وہ لفظ اپنے معنی حقیقی سے ہٹ کر قرینے کی موجودگی میں مجازی معنی میں استعمال ہوتا ہے اوراس نئے مطلب کو قاری تلازمے سے سمجھ پاتا ہے۔ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا کہنا ہے:

اظہار کے وسائل انگنت ہیں لیکن ان میں جو استعارے کو حاصل ہے وہ کسی دوسرے کو نہیں۔۔۔اخذ معنی کے عمل میں استعارے کی کارفرمائی صرف مجازی یالازم معنی تک محدود نہیں رہتی استعاراتی تفاعل میں دو عنصر ضروری ہیں'یعنی ایک جو حقیقی معنی کا منبع ہے اور دوسرا جو مجازی معنی کا سرچشمہ ہے۔۔۔زبان کے استعاراتی تفاعل کے دوران لفظ قمقموں کی طرح جلتے بجھتے رہتے ہیں اور بیک وقت معنی در معنی کا چراغاں ہوتا رہتا ہے کیونکہ اخذ معنی کا عمل اگرچہ شعور کی سطح پر ہوتا ہے'لیکن سو فیصد شعور کی سطح پر نہیں ہوتا اور لازمی معنی کو الگ الگ خانوں میں بند کرنا تقریبا نا ممکن ہے۔(۱۵)

لفظ کا ایک وضعی اور لغوی معنی ہے کوئی لفظ مشکل لگے تو لغت سے اس کا معنی نکال سکتا ہے اور جب کبھی لفظ اپنے لغوی حدود سے گزر کر کسی غیر کے معنی میں استعمال ہو تو اسے مجاز کہیں گے جس کا معنی لغت سے نہیں ملے گا بلکہ اس کی تفہیم کے لیے بلند تخیل چاہیئے مثلا شیر ایک چیڑ پھاڑ کرنے والے درندے کا نام ہے یہ اس کا لغوی معنی ہے اب جب یہی شیر کسی بہادر انسان کو کہے تو یہ شیر کا مجازی معنی ہے اور جہاں مجاز میں مشابہت کا پہلو ہو اور حرف تشبیہ نہ ہو تو استعارہ کہلائے گا۔

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے
رن ایک طرف چرخ کہن کانپ رہا ہے

اس مثال میں شیر سے مراد بہادر انسان یعنی'کربلا کے شیر حضرت عباس علیہ السلام ہیں۔

پس استعارہ کے لغوی،اصطلاحی معنیٰ اور علمائے قدیم جدید کے جملہ نظریات کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ہر لفظ اپنے معنی کے بیان کے لیے آئینہ کی مانند ہے یعنی ہر لفظ کا ایک لغوی اور وضعی معنی معین ہے اگر لفظ اپنے عرفی اور لغوی معنی میں استعمال ہوئے بغیر،معنوی تبدیلی کے ادعا کے ساتھ سیاق و سباق یا قرینے کی روشنی میں مشابہت'موازنہ یاتقابل کی بناپر غیر ما وضع لہ میں استعمال ہو اسے استعارہ کہیں گے۔

استعارے کی تخلیق

استعارہ جسے شاعری کا جوہر کہا جاتا ہے' کی تخلیق کے بارے میں چند نظریات قابل ذکر ہیں چنانچہ مولانا شبلی استعارے کو ایک فطری اور غیر اختیاری چیز گردانتے ہیں اور قائل ہیں کہ فرط انبساط اور درد والم کے لمحات میں زبان سے بے دریغ الفاظ وجملوں کی ہیئت میں نکلتے ہیں جیسا کہ شعر کے بارے میں غالب کا کہنا تھا:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے
غالب

مولانا" شبلی شعر العجم "میں لکھتے ہیں:

ایک عالی سے عالی بھی جب جوش یا غیظ و غضب میں لبریز ہو جاتا ہے تو جو کچھ اسکی زبان سے نکلتا ہے، استعارات کا قالب بن کر نکلتا ہے، غم اور رنج کی حالت میں انشا پردازی اور تکلف کا کس کہ خیال ہو سکتا ہے، لیکن اس حالت میں بے اختیار استعارات زبان سے ادا ہوتے ہیں مثلا کسی کا عزیز مر جاتا ہے تو کہتا ہے "سینہ پھٹ گیا" دل میں چھید پڑ گئے " آسمان ٹوٹ پڑا" تجھ کو کس کی نظر کھا گئی" یہ سب استعارے ہیں اس سے ظاہر ہو گا کہ استعارہ دراصل ایک فطری طرز عطا ہے۔(۱۶)

محمد حسن عسکری جہاں زبان کو استعارہ سے تعبیر کرتے دکھائے دیتے ہیں وہاں استعارے کی تخلیق کو زبان کی تخلیق سے قیاس کرتے نظر آتے ہیں کہ انسان کے انجذاب شدہ تجربوں کو خارجی کائناتی اشیا سے مطابقت یا مناسبت کی تلاش استعارے کے تخلیقی عمل میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ حسن عسکری لکھتے ہیں:

زبان انسان کے اندرونی تجربے اور خارجی اشیا کے درمیان مناسبت و مطابقت ڈھونڈنے یا خارجی اشیا کو اندرونی تجربے کا قائم مقام بنانے کی کوشش سے پیدا ہوتی ہے اور استعارے کی تخلیق کا عمل بھی بالکل یہی ہے ہماری زبان سے جو فقرہ نکلتا ہے وہ ہمارے بظاہر بھلائے ہوئے تجربات اور ہمارے گردوپیش کی زندگی کے ایک وقیع حصے سے مرکب ہوتا ہے'لہذا استعارے کی ولادت کا عمل ساری زندگی کا شعوری یا غیر شعوری طور پر احاطہ کرتا ہے،یوں کہیے کہ استعارے کی پیدائش کا عمل بالکل وہی جو خواب یا اسطور کی پیدائش کا ہوتا ہے۔ جیسے خواب میں ہماری پوری شعوری و لاشعوری ہستی اجاگر ہو جاتی ہے اسی طرح استعارے میں بھی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام نقوش ضم ہو جاتے ہیں استعارے کی تخلیق کے لیے انسان کو اپنے شعور اور گردوپیش کی زندگی سے آنکھیں چار کرنا پڑتی ہیں اور ذات کے خول سے نکل عالم معلوم سے پیوست ہونا پڑتا ہے۔یہی حال کسی زبان کی تخلیق کا بھی ہے۔(۱۷)

حسن عسکری سے ملتی جلتی بات ہمیں انیس ناگی کے ہاں بھی ملتی ہے انیس ناگی جہاں ایک ناول نگار ہے تو وہاں ایک اہم نقاد بھی ہے خاص کر ان کی کتاب "شعری لسانیات" کو اہم مقام حاصل ہے البتہ ان کی اصطلاحات کچھ نامانوس سی ہے اور قاری کو سمجھنے میں دقت کا سامنا ضرور رہتا ہے' ان کے ہاں استعارہ کی نمود میں انسان کا ذاتی تجربہ اور مشاہدہ اہم ہے کہ جس کے بل بوتے پر حیوان ناطق یعنی انسان تخیل کا سہارا لے اپنے نطق کے ذریعے خارج میں منطقی لحاظ سے نہ ملنے والی دو چیزوں میں وحدت پیدا کرتا ہے اور پہلے والے معنی کا لباس دوسرے کو پہناتا ہے۔ انیس ناگی اپنی کتاب "شعری لسانیات" میں لکھتے ہیں کہ

استعارہ کا ماخذ کوئی خاص تجربہ نہیں وہ اپنا تاروپود مختلف تجربات سے اخذ کرتا ہے اس اعتبار سے استعارہ ایک سیاق و سباق ہے جو مختلف تجربات کا مقام اتصال ہے استعارہ تجرباتی کثرت میں معنوی وحدت انتخاب اور امتزاج سے پیدا کرتا ہے اسطرح ادراک اور احساس کی ایک سطح مدون کرتا ہے جس میں شرکت کے ذریعے تجربات کی تہہ تک رسائی حاصل کی جاسکتی ہے استعارہ بیک وقت ایک ذہنی اور لسانی عمل ہے جو خارجی اور واقعی انسانی کائنات کو ایک قابل فہم سطح پر متصل کرتا ہے۔ شاعر کے ذہنی مضمرات تب ہی قابل فہم ہو سکتے ہیں اگر ان کے معروضی حقائق سے کوئی علاقہ اس صورت میں استعارہ شاعر کی داخلی واردات کو خارجی واقعات اور حقائق سے متعلق کرتا ہے اور خارجی حقائق کو جذبہ اور تاثر کی داخلیت سے متعارف کراتا ہے۔ چنانچہ اس عمل میں استعارہ کی حیثیت ایک ایسے پل کی ہے جو شاعر کے تخلیقی شعور کو دو دنیاؤں سے متعارف کرتا ہے۔(۱۸)

انسان کو جہاں دیگر نعمات سے نوزا ہے وہاں اسے عقل، تخیل، حواس خمسہ اور خاص زبان سے بھی بہرہ ور فرمایا ہے جیسا کہ قرآن میں سورہ رحمٰن کے آغاز میں ارشاد رب العزت ہو رہا ہے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔الرحمٰن۔خلق الانسان۔علّمه البیان یعنی انسان کو حیوان ناطق بنا کر خلق کیا جس کے ذریعے انسان دیگر حیوانات کی نسبت ماضی کو دہرا سکتا ہے، حال کو بیان کر سکتا ہے اور مستقبل کے بارے میں رائے دے سکتا ہے اور یہ تمام چیزیں زبان کے ذریعے ممکن ہے۔ ہر زبان کے اپنے الفاظ ہیں اور ان کا معنی متعین ہے۔ انسان دنیا میں واحد مخلوق ہے جس کے پاس تخیل کی دنیا بھی ہے جس کی روشنی میں مشاہدات میں آنے والی چیزوں میں یگانگت پیدا کرتا ہے اور دو چیزوں کے نکتہ اشتراک کو لے کر اور اسے مقدر رکھ کر، من تو شدی 'تو من شدی کی مکمل تصویر سامنے لاتا ہے۔ اور یہ کام بلند پرواز تخیل کے مالک انسان ہی کر سکتا ہے اس میں بڑی جگر کاوی چاہیے اس ضمن میں محمد حسن عسکری اور

انیس ناگی سے بھی واضح اور رواں لفظوں میں بشیر بدر نے استعارے کی تخلیق کی کیفیت کا نقشہ کھینچا ہے۔ چنانچہ "آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی جائزہ" میں لکھتے ہیں:

دو چیزوں کے ان دیکھے رشتوں کو دریافت کرنے اور انہیں باہم مربوط کر کے ذہن و احساس کو سوچنے اور محسوس کرنے کے بہت سے گوشے عطا کرتی ہے یہاں محض زبان دانی سے کام نہیں چلتا بلکہ ہزاروں بار دیکھی ہوئی چیزوں میں ایک یا کئی رشتے اور مطابقتیں تلاش کرنے کے لیے زور تخیل کے ساتھ ساتھ بدن کی تمام حسی قوتوں کو بروئے کار لانا ہوتا ہے دیکھنے، چھونے، چکھنے، سونگھنے کی حسیات دو غیر متعلق چیزوں کے انجانے رشتوں کی دریافت کر لیتی ہے۔ زندگی کی معمولی چیزوں کو انوکھی اور وقیع نظر سے دیکھنا کہ اس کی خفیہ اور پوشیدہ اصلیت اوپر آجائے اور عمومی خصوصیت ثانوی چیز ہو جائے یہ ایک خلاقانہ عمل ہے۔(۱۹)

عام ذی روح سے ہٹ کر انسان ایک ایسا مخلوق ہے جو قوت متخیلہ سے سرفراز ہے وہ اپنے تجربات کو خارجی چیزوں سے ساتھ مطابقت پیدا کر کے منطقی لحاظ سے نہ ملنے والے رشتوں اور سلسلوں میں ربط پیدا کرتا ہے تو استعارہ وجود میں آجاتا ہے جیسے

سیاہ شام کے نیزے پہ آفتاب کا سر
کس اہتمام سے پروردگار شب نکلا

افتخار عارف

اس شعر میں شاہد مثال نیزے پہ آفتاب کا سر ہے عام انسانی عقل اور منطق' آفتاب کے سر ہونے کے قائل نہیں اس سے عجیب تربات یہ ہے کہ نیزے پہ آفتاب کا سر اگر ہے تو کیسے آسکتا ہے اور کیسے سما سکتا ہے پس یہاں پہ مجازی معنی لینا ہوگا اور وہ بھی استعارہ قرار دے کر۔ پس اس شعر میں غور کرے تو شاعر اپنے مطالعات اور ذہنی لگاؤ کی روشنی میں کربلا اور اس کے متعلقات سے آگاہ ہے اور ان کو اپنے وجود اور تجربات کا حصہ بنایا ہے آگے جاکر شاعر کی نظر آفتاب پہ گئی اور واقعہ کربلا کے عظیم کردار یعنی امام حسین کے سر کے نوک نیزہ پر دشمنوں کے اُٹھائے جانے کے واقعے کے ساتھ تطابق دے کر اپنے عہد کی منظر کشی کی ہے۔ پس تخیل کے بل بوتے' انسان شعوری طور پر اور لاشعوری طور پر اپنی ذات میں مجذوب تجربات کو خارجی اشیا کے ساتھ معنوی تطابق دیتا ہے تو استعارہ کشود ہوتا ہے۔

استعارے کی اہمیت'افادیت اور اہداف ومقاصد:

غزل کی خوبی اسکی رمزیت، تہہ داری اور ایمائیت میں ہے اور یہ چند وسائل سے پیدا ہو سکتی ہے۔ان میں تشبیہ،کنایہ، تلمیح اور خاص کر استعارہ سر فہرست ہیں استعارے سے جہاں بیان میں رونق آتی ہے وہاں معنی میں بھی تاثیر اور چاشنی در آتی ہے اس حوالے سے شمیم احمد کا کہنا ہے:

شعری زبان عام مستعمل زبان سے ان معنوں میں علیحدہ ہوتی ہے کہ اس میں اظہار مجمل ہونے کے باوجود نہایت بلیغ ہونا چاہیے۔اس لیے جذبہ واحساس کی درست ترین صورت گری کی خاطر سفری اظہار کے واسطے کچھ ایسے لفظی سہارے ضروری ہوتے ہیں جو اجمال میں تفصیل اور بیان میں صنائع بدائع، تشبیہوں،استعاروں اور علامتوں کو جنم دیا ہے یہ وہ لسانی سرمایہ ہے جو تمام شاعری کی اساس ہوتا ہے۔اور اس سے پیش از پیش استعارے کے ذریعے شعری زبان مؤثر اور طاقتور بنتی ہے۔(۲۰)

استعارہ تحریر کو حسن سے نوازتا ہے تشبیہ میں مشبہ اور مشبہ بہ میں ایک خاص تعلق ضرور ہوتا ہے لیکن من وتو کا امتیاز اپنی جگہ بصورت اتم رہتا ہے'اس کے بر خلاف استعارے میں مشبہ اور مشبہ بہ یک دو قالب بن کر من تو شدم اور تو من شدی کی تفسیر بن جاتے ہیں اور یوں استعارہ اپنی تاثیر میں کئی گنا افزوں ہو جاتا ہے۔ڈاکٹر یوسف حسین اپنی کتاب "اردو غزل" میں لکھتے ہیں:"استعارہ معنی آفرینی اور جدت ادا کا ایک زبردست وسیلہ ہے جسے تغزل میں برتنا شاعرانہ کمال پر دلالت کرتا ہے اور اس کے ذریعے خیال کی بالیدگی اور رسائی میں اضافہ ہوتا ہے اور معمولی بات کہاں سے کہاں پہنچایا سکتا ہے"(۲۱)

شعر کی تاثیر کا انحصار لفظوں کے برجستہ اور موزوں استعمال پر منحصر ہے لیکن شعر کی روح چونکی رمز و اشارہ میں مخفی ہوتی ہے اس لیے لفظوں کے معنی میں تشبیہ'استعارہ کنایہ سے وسعت پیدا کی جاتی ہے تشبیہ میں وہ قوت نہیں ہوتی جو استعارہ اور کنایہ میں پائی جاتی ہے اس لیے کہ رمز وابہام کا ایمائی عنصر استعارے کی نسبت کم ہوتا ہے اسی بات کو سید عابد علی عابد اس پیرائے میں بیان کرتے ہیں:

استعارہ اور کنایہ کی مدد سے جذباتی حقائق کی بوقلمونی ایک لمحے میں دل نشین ہو جاتی ہے جس کی وضاحت اگر منطقی طرز میں کی جائے تو صفحہ کے صفحے سیاہ ہو جائیں لیکن اصل بات کا پتا نہ چلے۔استعارہ ایک طرح کا پس منظر مہیا کرتا ہے جس پر شاعر کی بصیرت حرکت کرتی ہوئی نظر آتی ہے غزل میں استعارہ اور کنایہ کو اہمیت حاصل ہے اور نظم میں تشبیہ کو'اسلیے کہ ثانی الذکر کا مقصد تفصیل اور تشریح سے مضمون کو سامع کے دلنشین کرنا ہے اور اول الذکر کا رمز وایما

کے ذریعے تحیر میں اضافہ۔ استعارہ معنی آفرینی اور جدت ادا کا وسیلہ ہے جسے تغزل میں برتنا شاعرانہ کمال پر دلالت کرتا ہے۔(۲۲)

محمد حسن عسکری جنہیں پاکستانی ادب کے بنیاد گزاروں میں شمار کیے جاتے ہیں اردو تنقید میں ان کا بڑا نام ہے استعارہ کے اوپر ان کا مضمون تشنہ بہ تجزیہ ہے اولاًوہ استعارے کو زبان کے ترادف جانتے ہیں ثانیاً استعارے کی افادیت کے ضمن میں بھی وہ دوسروں سے الگ نظر رکھتے ہیں ان کا کہنا ہے:

اس(استعارہ)کے ذریعے اپنا بھولا ہوا تجربہ زندہ ہوتا ہے اپنے جو قوت کے سرچشمے عقل وخرد کی مٹی کے نیچے دبے پڑے ہیں ان تک رسائی حاصل ہوتی ہے لیکن اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ استعارہ جذبے اور فکر کی علحدگی ختم کرکے انہیں ایک دوسرے میں جذب کر دیتا ہے شعور و لاشعور، جسم و دماغ فرد اور جماعت انسان اور کائنات کا وصال اسی کے وسیلے سے ہوتا ہے اس کا اثر دیرپا نہ ہو بہرحال جو شخصیت کئی ٹکڑوں میں بٹ گئی ہو اس کا علاج وقتی طور پر ہی سہی استعارہ کرتا ہے انسانی وجود اگر کہیں وحدت کی شکل میں نظر آتا ہے تو استعارے ہیں۔(۲۳)

استعارہ کے ذریعے سے اسلوبیاتی اور معنوی اعتبار سے کئی فائدے اخذ کیے جاسکتے ہیں ایک تو یہ کہ کلام کی مکمل توضیح ہوتی ہے استعارہ مستعارلہ کے لیے کئی صفات کو ایک ساتھ کہہ بیان کرتا ہے۔مثلاً محبوب کو گل کہہ کر محبوب کو نزاکت، دلکشی، شگفتگی اور مہک کا حامل بنا کر پیش کرتا ہے۔دوسرا فائدہ یہ ہے کہ استعارہ کے ذریعے معنی کے سمندر کو کوزے میں بند کیا جاسکتا ہے۔استعارہ سماج، نفسیات، سیاست اور تاریخی پس منظر کا حامل ہو کر پورے داستان کو ایک لفظ میں بیان کرسکتا ہے۔تیسرا فائدہ یہ ہے کہ استعارہ کے برتنے سے کلام میں حسن تاثیر پیدا ہوتا ہے اور جس خیال کی بلندی پر پہنچ کر شاعر نے شاعری کی قاری استعارے کی تفہیم سے وہاں تک رسائی حاصل کرکے مسرت کا احساس کرکے جمالیاتی تسکین کرتا ہے۔سب سے بڑھ کر استعارہ کے بارے میں یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ یہ لاشعور کی تاریک تہوں سے نکلتا ہے اس وجہ سے شاعر کا تذکیہ نفس بھی ہوتا ہے۔اور یوں نفسیاتی پیچیدگیوں کا ازالہ بھی ہوتا ہے۔اس ضمن میں یہ جملہ راقم الحروف کی تائید کرتا ہے "استعارہ ہمیں کلام میں اضافی رنگ اور گہرائی فراہم کرتا ہے جو نہ صرف بیان کو خوبصورت بناتا ہے بلکہ معنی کو بھی مؤثر بناتا ہے(۲۴)

مذکورہ بیانات کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں استعارہ شعری وسائل میں سے ایک اہم وسیلہ ہے جس کے ذریعے سے کسی چیز کے تبدیل حقیقت کا ادعا کیا جاسکتا ہے تو من شدی والی کیفیت پیدا کی جاسکتی ہے اور شعر میں شدت اور تاثیر بھی لائی جاسکتی ہے اور استعارے کے پس پردہ شاعر اور شاعر کا عہد چھپا ہوتا ہے اس ضمن

میں شان الحق ایک انگریز خاتون سٹن یروک روز کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ استعارہ نفس مضمون کے علاوہ شاعر کی شخصیت پر بھی روشنی ڈالتے ہیں ان سے اُس کے تخیل کی پہنچ اور مشاہدہ و تجربہ کی حدود کا پتہ چلتا ہے یعنی اس کی نظر زندگی کے کن کن گوشوں تک گئی ہے اور کہاں کہاں سے اس نے اثرات قبول کیے ہیں، یوں ترتیب و تقسیم سے بڑے دلچسپ نتائج پیدا کیے ہیں(۲۵)اس کے علاوہ استعارہ کے ذریعے کچھ نہ کہتے ہوئے بہت کچھ کہے جا سکتے ہیں اور اپنی بھڑاس نکال بھی سکتا ہے اور بڑی بات یہ ہے کہ بہت کچھ کہہ گزرنے کے باوجود راہ فرار بھی استعارہ فراہم کر سکتا ہے۔

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
فیض احمد فیض

اس شعر میں سحر کامیابی کا استعارہ ہے سحر جس کے بارے میں ہر شاعری کے شد بود رکھنے والا جانتا ہے قدیم و جدید ہر غزل گو شاعر نے اپنے غزل میں استعمال کیا ہے خاص کر ترقی پسند شعرا کے پسندیدہ الفاظ میں سے ایک ہے اس شعر میں بیک وقت شدت تاثیر اوراختصار بھی ہے اور کچھ نہ کہتے ہوئے بہت کچھ شاعر کہہ گیا ہے اور اپنے لیے فرار کا راستہ بھی محفوظ رکھا ہے۔ پس استعارہ کی کشید سے معنی میں ایک گونہ تاثیر "توضیح اور ایجاز کی کی کیفیت آجاتی ہے اور ساتھ ہی معنی آفرینی بھی ہو جاتی ہے اور یوں ایک پورے داستان 'فکر و تصور' اور تاریخ وغیرہ کا پس منظر مہیا کرتا ہے۔

استعارے کا اطلاق:

کیا استعارہ صرف اس لفظ کو کہ جو غیر ما وضع لہ میں استعمال ہو جہاں تشبیہ کا تعلق ہو' کو کہا جاتا ہے یا ایک محاورہ' ایک ضرب المثل، ایک تلمیح، ایک جملہ ایک علامت، ایک مصرعہ یا ایک غزل یا ایک مکمل نظم کو کہا جا سکتا ہے آیئے ذرا دیکھتے ہیں اس ضمن میں علمائے بلاغت کیا کہتے ہیں۔

صاحبان مختصر المعانی' حدائق البلاغت اور جواہر البلاغت سے اس بات کا استفادہ ہوتا ہے کہ استعارہ صرف الفاظ کے ساتھ خاص ہے لہذا ان کے مطابق استعارہ 'الفاظ کا قرینے کی موجودگی میں تشبیہ کے تعلق کے ساتھ مجازی اور غیر وضعی معنی میں استعمال سے عبارت ہے ڈاکٹر یوسف حسین پورے شعر کے استعارہ ہونے کے قائل ہیں اس حوالے سے ان کا کہنا ہے

زندگی اور خارجی حقیقت کی ہو بہو نقل کے بجائے استعارے اور کنائے سے اس کی توجیہ اور باز آفرینی ہوتی ہے غزل میں یہ استعارے صرف لفظوں کے نہیں ہوتے بلکہ پورا شعر کے شعر استعارے کہے جاسکتے ہیں جن میں تخیل کی روح رچی ہوئی ہوتی ہے(۲۶)جابر علی سید محاورہ' علامت' ضرب المثل 'اور پہیلی کو بھی استعارہ نام دیتے ہیں جیسا کہ ان کا کہنا ہے:

استعارہ شعری علامت کی صورت اختیار کر کے تخیل کی سیر بینی کا مظہر ہے اور ضرب المثل میں حقیقت اور مجاز دونوں کے اجتماع کا ضامن ہے پہیلی میں عمومی تخیل کو مہمیز دی جاتی ہے ارد گرد کی مانوس اشیا کو غیر مانوس اشیا کے ذریعے سے پہچانا جاتا ہے استعارے کی بنیاد تشبیہ پر ہے اور یہ تشبیہ کی مختصر صورت ہے اس میں اختصار کا عمل اور مقصد بلاغتی سے زیادہ جمالیاتی ہے(۲۷)

اکثر ماہرین بلاغت اس بات کے قائل ہیں کہ محاورہ میں بھی استعارے کے رنگ غالب نظر آتے ہیں کیونکہ محاورہ میں بھی مجازی معنی لیاجاتاہے اورایک طرح سے تشبیہ کے قریب بھی ہے لہذااستعارہ کاایک وصف شباہتوں کو تلاشنا ہے لہذا محاورہ بھی استعارہ کے دھارے میں شامل ہو سکتا ہے جیسا کہ شمس الرحمن فروقی اپنی کتاب تنقیدی افکار میں رقمطراز ہیں:

حاورہ وہ عبارت ہے(الفاظ کا وہ مجموعہ ہے)جس میں شکل یعنی(ترتیب)ہمیشہ ترمیم ناپذیر اور متعین اور جس کے مفصل معنی خود اس کے اندر موجود ہوتے ہیں لیکن اکثر وہ معنی ظاہر نہیں بلکہ Implicit ہوتے ہیں کیونکہ محاورے میں استعمال ہونے والے الفاظ زیادہ تر استعاراتی رنگ لیے ہوئے ہوتے ہیں بلکہ اکثر محاورے استعارہ ہی ہوتے ہیں محاورے کے معنی بھی سیاق وسباق کے محتاج نہیں ہوتے(۲۸)

جس طرح محارہ اپنی جگہ ایک استعارہ ہے اسی طرح ضرب المثل بھی استعارے کا رنگ لیا ہوا ہوتا ہے ضرب المثل میں استعارے کا رنگ فطری ہے لیکن ہر ضرب المثل میں استعاراتی کیفیت برابر کے درجے کی نہیں ہوتی بعض میں کم ہوتی ہے تو بعض میں زیادہ۔(۲۹)ڈاکٹر ضیا الحسن اپنے ایک مضمون "غزل اور غزل کی تنقید" میں لکھتے ہیں"غزل کے شعر میں استعمال ہونے والا لفظ کبھی تلمیح کے طور پر استعمال ہوتا ہے، کبھی علامت کے طور پر، کبھی استعارہ بن جاتا ہے اور کبھی تشبیہ۔(۳۰)

یہ بات واضح سی بات ہے کہ استعارہ نہ تو مجرد تشبیہ ہوتی ہے اور نہ کذب اور نہ تلمیح کی ایک قسم ،بلکہ استعارہ اپنا ایک مستقل وجود رکھتا ہے البتہ اس میں بحث ہے کہ استعارہ اور علامت ایک ہی چیز کے دونام ہیں یاعبارة شتّٰی و حسنک واحد ہے اس حوالے سے جابر علی سید کا کہنا ہے کہ

علامت استعارے کی ارتقائی صورت ہے صوفیانہ شاعری میں علامتیں بنیادی طور پر استعارے ہی ہیں جام،زلف،میخانہ،ساقی،پیر مغاں،مے ،آئینہ، گل، بحر،موج،قطرہ وغیرہ صوفیانہ تصورات کے استعارے تھے اب انہیں علامتیں کہا جانے لگا ہے لیکن علامت استعارے سے کسی قدر مختلف بھی ہے اور وسیع تر بھی۔ صلیب عیسائیت کی علامت بھی ہے اور غم بھی، گل رخ محبوب کی نمائندگی بھی کرتا ہے اور حسن مطلق کی بھی(۳۱)

جیسا کہ یہ بات واضح ہے استعارہ علم بیان کی ایک قسم ہے جو کہ عربی سے اردو میں آئی۔ علم بیان کے بارے میں ہم کہہ سکتے ہیں زبان کے ذریعے ایک ہی مطلب کو مختلف طریقوں سے اظہار و ابلاغ کرنے کا نام بیان ہے۔ بیان کی دو قسمیں کرتے ہیں ایک حقیقت اور ایک مجاز۔ الفاظ کا اپنے معانی عرفی،وضعی اور لغوی میں استعمال حقیقت ہے اوراس کے برعکس ان کے غیر میں استعمال کو مجاز کہیں گے پھر آگے مجاز کی تقسیم بندی کی جاتی ہے اس کی ایک قسم استعارہ ہے جہاں تشبیہ کی موجودگی اور حرف تشبیہ عدم موجودگی کے مقام پر لفظ اپنے متداول معنی کے غیر میں قرینہ کی بنا پر استعمال ہو تو اسے استعارہ کہیں گے یہاں تک علمائے بیان عرب بھی کہتے ہیں لیکن اردو کے چند نقاد ان سے کافی حد تک آگے نکل کر بڑے پتے کی بات کی ہے۔

استعارہ عربی شعریات سے اسی اصطلاح میں منہ و عنہ اردو میں داخل ہوگئی 'کچھ نے اردو میں صرف ترجمہ کر کے استعارے کا معنی بتایا ہے البتہ اردو کے چندیں نقاد نے اسے کچھ نیا رنگ روغن بھی دیا ہے اوراس کے کئی جہات کی طرف توجہات مبذول کرائی جیسا کہ پہلے بیان ہوا کہ استعارہ صرف لفظ تک محدود نہیں ایک فقرہ،ایک مصرعہ،ایک شعر حتّٰی کہ محاورات، ضرب المثل، پہیلیاں اور تلمیحات بھی استعارے کی ہیئت میں ڈھل سکتی ہیں اب آج کل "علامت" کا لفظ زیادہ ادب میں آنے لگا ہے یہ انگریزی کے لفظ" سمبل" کا اردو ترجمہ ہے یوں تو علامت مغرب میں ایک تحریک کی صورت میں سمبلزم کے نام سے منظر عام پر آئی۔ اس ضمن میں ڈاکٹر عابد حسین سیال لکھتے ہیں:

جدیدیت کی تحریک جن مغربی تحریکوں سے متاثر تھی،ان میں علامت نگاری کی تحریک کا کردار بھی بنیادی ہے۔ لہٰذا جدیدیت جن رویوں سے متشکل ہوئی ان میں علامت نگاری کا رجحان نمایاں تر ہے۔اس کا اثر تمام ادبی اصناف پر پڑا۔ جدید نظم اور افسانے میں علامت نگاری نے باقاعدہ ایک رجحان کی شکل اختیار کرلی۔ غزل میں یہ رجحان کسی حد تک نظم ہی کے زیر اثر آیا(۳۲)

اردو دنیا جدیدیت کے بعد جس تحریک سے متاثر تھی وہ یہی سمبلزم تحریک تھی' جس کے زیر اثر اردو کے اصناف ادب میں سے ناول،افسانہ اور ساتھ ہی غزل میں بھی علامت کو شعراء برتنے لگے۔جب سے علامت آئی ہے علماء بلاغت اوار دور نقادوں کے ہاں یہ ایک مکمل بحث بن چکی ہے کہ کیا استعارہ اور علامت ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں یا بالکل ایک دوسرے سے الگ؟ کیا ان میں کوئی جہت اشتراک ہیں۔ اگر جہت اشتراک ہیں تو کیا جہت افتراق بھی ہیں اس ضمن میں بہت سوں نے اپنی بساط کے مطابق گفتگو بھی کی ہیں اور آرٹیکلز بھی لکھے ہیں مقالہ نگار کا مقالہ اس متحمل نہیں ہے کہ جس میں تفصیلی بحث ہو۔ البتہ چند ایک پہلو کی طرف اشارہ کرنا فائدے سے خالی نہیں ہے۔ علامت کی تعریف ڈاکٹر حامد کاشمیری ان الفاظ میں کرتے ہیں:

علامت کے بارے میں عمومی تصور یہ رہا ہے کہ یہ کوشش سے ایجاد نہیں نہیں کی جاتی بلکہ تمدنی ورثے سے دجود میں آتی ہے۔ کسی لفظ کے ساتھ رفتہ رفتہ کچھ قدریں اور تصورات وابستہ ہو جاتے ہیں۔ یہ تصورات علاقے ،تہذیب،عقائد،معاشرت اور تاریخ وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور یہی تصورات لفظ کو علامتی اقدار دیتے ہیں جو اسے موقع محل کے مطابق معنی کی نئی جہتوں سے روشناس کرتے ہیں(۳۳)

البتہ مختصر الفاظ میں اتنا کہا جاسکتا ہے کہ استعارہ اور علامت کے درمیان عام وخاص من وجہ کی نسبت ہے یعنی ایک لفظ اگر استعارہ بننے کی سکت رکھتا ہے تو ممکن ہے یہ لفظ علامت بھی بن جائے یا اس کے برعکس۔ جیسے ان اشعار میں دیکھے جاسکتے ہیں

قافلہ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں
گرچہ دراز ہیں گیسوئے دجلہ وفرات
علامہ اقبال

میرا حسین ابھی کربلا نہیں پہنچا
میں حر ہوں اور ابھی لشکر یزید میں ہوں
نثار ترابی

مذکورہ اشعار میں سے لفظ حسین بطور استعارہ اور علامت دونوں طرح سے استعمال ہوئے ہیں یعنی آج کا پُر آشوب اور آفت زدہ معاشرہ حریت فکر دلانے والے رہبر سے خالی ہے آج حسینِ عصر مھدیِ دوراں پردۂ غیب میں تشریف فرماہیں تواس وجہ سے شاعر اپنے آپ کو حر کی طرح عصر حاضر کے یزیدی لشکر میں محسوس کر رہا ہے۔

پس ایک جہت کے سے دیکھا جائے تو استعارہ اور علامت ایک ہی اصل کے دو نام ہیں بس اتنا فرق ہے کہ استعارے کی اصطلاح کو عرب سے درآمد کیا جبکہ سمبل کو انگریزوں سے ترجمہ کر کے علامت کے عنوان سے اردو میں جگہ ملی۔یعنی ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ جدیدیت کی تحریک کے اثرات اردو پر پڑنے سے پہلے استعارہ کا زور و شور تھا'جب علامت کی اصطلاح اپنے شباب کے ساتھ آئی تو ساتھ ہی جدید سے جدید تر ہونے کی دھن میں نقادوں سے بڑے پیمانے پر"علامت"کو فروغ دیا نتیجے میں استعارہ کا لفظ کچھ دھیما سا پڑ گیا۔

جدیدیت کے بعد علامت کی اصطلاح جہاں جہاں استعمال ہوئی ہے بیشتر مقامات پر اس سے مراد استعارہ ہی ہے لیکن کئی حوالون سے اور چند مقامات پر یہ ایک دوسرے سے مختلف بھی ہو سکتے ہیں جس کی تشخیص سیاق و سباق کی روشنی میں ممکن ہے۔البتہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ علامت 'استعارے سے آگے کی چیز ہے۔علامت زیادہ پہلو دار اور متنوع معنی کے حامل ہوتی ہے۔

ہر عہد کے تقاضوں کے مطابق استعارات میں نئے معنوی امکانات:

جس طرح الفاظ پیدا ہوتے ہیں عالم شباب کو چھو کر بوڑھے ہو جاتے ہیں مر کھپ جاتے ہیں بالکل اسی طرح زمانے کے گزرنے کے ساتھ ساتھ استعارے کثرت استعمال کی وجہ سے اپنی اہمیت کھو بیٹھتے ہیں لیکن نباض شاعر اپنے عہد سے استعاروں کو ہم آہنگ کر کے پرانے اور کلاسیکی استعارات کو نئے مفاہیم سے ہمکنار کرتا ہے اس ضمن میں وقار احمد لکھتے ہیں:

تشبیہوں اور استعاروں کی نئ دریافت کے ساتھ ساتھ پرانی تشبیہات اور استعارات کو زندگی کے نئے اور بدلتے ہوئے طرز احساس کے ساتھ ہم آہنگ کر کے بھی معنوی جدت اور ندرت کے امکانات کو تلاش کیا جاسکتا ہے اردو شاعری کے ابتدائی ادوار میں ہمارے شعرانے فارسی زبان کی تشبیہوں اور استعاروں کو انہی معنوں میں استعمال کیا

جس طرح فارسی زبان کے شاعر انہیں استعمال بھی کرتے تھے تاہم جیسے جیسے اردو زبان اور شاعری نے ترقی کی' ویسے ویسے فارسی زبان سے مستعار لی گئیں تشبیہ و استعارات ہمارے شاعروں کے اپنے خیالات و افکار کی ترجمانی کرنے لگے اور عہد بہ عہد ہونے والے سماجی وسیاسی تغیرات سے ان کی معنوی ساخت بھی تبدیل ہونے لگی کسی بھی زبان میں پہلے سے موجود تشبیہ واستعارہ میں معنیاتی تغیر نئے معنوی امکانات کی طرف بڑا قدم ہوتا ہے یہ حقیقت ہے کہ زبان وبیان کے ابلاغ میں معنوی تازگی کو برقرار رکھنے کے لیے ہر عہد کے مطابق پرانے استعارے اور تشبیہات کے ساتھ نئے استعارے اور تشبیہات بھی تلاش کرنی پڑتی ہے(۳٤)

شاعری ایک عہد کی ترجمانی کا فریضہ سر انجام دیتی ہے ان میں سے خاص کر غزل ہر عہد کی رگوں میں دوڑ کر اپنی انفرادیت کالوہامنواتی ہے۔اس مقصد کے لیے وہ استعارہ سے سہارالیتی ہے اور استعارہ بھی ایسا ہوناچاہیے کہ وہ اپنے عہد کے ساتھ معنوی ربط کے حامل ہو' تاکہ اس کے ذریعے واضح خطوط پر روح عصر کی ترجمانی ہو سکے اس بارے انیس ناگی"تنقید شعر"میں لکھتے ہیں:

استعاروں کی معنویت کا سیاق وسباق بدلتا رہتا ہے جبکہ سیاق وسباق کا مدار تخلیقی عہد میں مروجہ زندگی سے ہوتا ہے اس لیے جب ایک عہد کے استعارے دوسرے عہد میں منتقل ہوتے ہیں تو ان کی چمک ماند پڑ جاتی ہے اس لئے یہ ضروری ہے کہ ہر تخلیقی عہد اپنے مزاج اور تقاضے کے مطابق نئے استعارے وضع کرے۔ مزاج اور تقاضے کے مطابق نئے استعارے وضع کرے۔ مروجہ استعارے جب زندگی کے بدلے ہوئے چلن میں تشریح سے عاری جاتے ہیں تو ان کی میعاد بھی ختم ہو جاتی جاتی ہے۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہو گا کہ جو تخلیقی عہد نئے عہد استعاروں کی تشکیل سے گریز کرتا ہے وہ اپنے عہد سے دیدہ ودانستہ طور پر رہنا چاہتا ہے۔(۳۵)

استعارہ کبھی مرتا نہیں ہے البتہ کی میعاد ختم ہوسکتی ہے اس کے طے شدہ معنی میں کہنگی آسکتی ہے ۔ لیکن تناظر کے فرق کے ساتھ نئے معنی میں استعاروں کو برتا کر نئی معنویت لائی جاسکتی ہے جس سے لفظ میں بھی جان آتی ہے اور شاعری بھی کمال کی ہوتی ہے۔ جیسے کلاسیکی غزل سے لے اب تک غزل گو گل وبلبل،چمن،ساقی و شراب و دیگر استعارے استعال کرتے آئے ہیں البتہ معنوی فرق کے ساتھ اور وہ فرق اس اعتبار سے کہ غزل گو شعرا نے اپنے عہد کے مطابق کبھی ان کو عشق مجازی، کبھی عشق حقیقی اور کبھی وطن سے استعارہ بنا کر استعمال کیے ہیں۔

حفیظ صدیقی کا کہنا ہے:

"ہر دور میں شعرا نے علامتی اظہار سے کام لیا ہے ہر استعارہ ایک علامت ہے کیوں وہ اپنی لغوی حدود سے ماورا کسی اور چیز کی نشاندہی کرتا ہے ۔غزل کی شاعری کی تمام تر علامتی شاعری ہے غزل میں گل و بلبل'شمع و پروانہ'بہار و خزاں'دارورسن'آشیاں و قفس قطرہ ودریا'بادہ و جام علامتوں کی حیثیت رکھتے ہیں اور اعتراض صرف ایک حد تک درست ہے کہ کثرت استعمال کے باعث استعارہ یا علامتیں اپنی ندرت کھو بیٹھتی ہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ صدیوں کی روایت نے الفاظ کے علامتی مفہوم میں ایسی وسعتیں اور گہرائیاں پیدا کر دی ہیں جن کی مثال یورپ کی ادبیات میں ملنا مشکل ہے بڑے شعرا ان علامتوں میں نئے معانی بھی سموتے رہتے ہیں "فرہاد" کو ایک عاشق کی مثال کی علامت کے طور پر پیش کیا جاتا رہا لیکن علامہ اقبال نیا اور فیض نے مزدور طبقے کی علامت کے طور پر استعمال کیا علامہ اقبال نے "شاہین" کو مرد ممناور "لالہ" کو ملت بیضا کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے مولانا روم نے روح انسانی کے لیے "لے" کی علامت استعمال کی ہے(۳٦)

استعارہ الفاظ کے مقابلے میں گزرتے وقت کے ساتھ اپنا معنی بدلنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور ہر عہد سے ہم آہنگ ہونے کی سکت رکھتا ہے اب یہ تخلیق کار کے اوپر منحصر ہے کہ وہ اس بت کو کیسے تراشتا ہے۔انیس ناگی کا کہنا ہے "غزل کی لفظیات زمانے اور موضوع کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں ایک مخصوص وقت کے بعد اس کا علامتی و استعاراتی نظام بے معنویت کا شکار ہو جاتا ہے اور کلیشے بن جاتا ہے اس صورت میں نئے شاعر اپنے دور اور اس کے بنیادی مسئلے کے حوالے سے اس کا ایک نیا علامتی و استعاراتی نظام وضع کرتے ہیں"(۳۷)

لفظ کا استعمال تخلیقی ادب میں چاہے چاہے تشبیہاتی یا استعاراتی ہو یا پھر اس کے علاوہ کچھ اور ہر عہد کے تخلیقی رویے کے ساتھ اس کی معنوی صورت بدلتی رہتی ہے اور ساتھ ہے ہر عہد میں اپنے استعارے وجود میں بھی لائے جاسکتے ہیں۔بشیر بدر لکھتے ہیں:

"نئے استعاروں کی تلاش دو چیزوں کے ان دیکھے رشتوں کو دریافت کرنے اور انہیں باہم مربوط کر کے ذہن و احساس کو سوچنے اور محسوس کرنے کے بہت سے گوشے عطا کرتی ہے ہیں محض زبان دانی سے کام نہیں چلتا'بلکہ ہزاروں بار دیکھی ہوئی چیزوں میں ایک یا کئی رشتے اور مطابقتیں تلاش کرنے کے لیے زور تخیل کے ساتھ ساتھ بدن کی تمام حسی قوتوں کو بروئے کار لانا ہوتا ہے دیکھنے ،چھونے ،چکھنے ،سونگھنے کی حسیات دو غیر متعلق چیزوں کے انجانے رشتوں کو دریافت کر لیتی ہے زندگی کی معمولی چیزوں کو اس انوکھی اور وقیع نظر سے دیکھنا کہ اس کی خفیہ اور پوشیدہ 'اصلیت اوپر آجائے،اور عمومی خصوصیت ثانوی ہو جائے یہ ایک خلاقانہ عمل ہے۔۔۔استعاروں ہی کا کام ہے کہ سرخ اور نیلی

ہوشا کیں پہنے' پھول جیسے بچے سرخ' نیلے چاند تارے نظر آنے لگتے ہیں' دور ہوتی کشتیوں کا استعارہ سب کچھ چھوٹ جانے کا دکھ، اور اندیشی پیش کرتا ہے وحشی چڑیا اور جنگ کے دوران فوجی ایک نظر آتے ہیں بادل آوارہ پریتم کا برگ بزرگ دیوتا کا مندر زمانے اور جلتی مٹی پیاسی زندگی کا استعارہ ہو جاتی ہے۔(۳۸)

ہر دور کے اپنے استعارے ہوتے ہیں ان تک رسائی حاصل کرنا ہر بڑے شاعر کی ذمہ داری بنتی ہے کب تک کلاسیکی لفظیات اوراستعاروں میں نئی معنویت لاکراستعمال شدہ کارتوس کوبروئے کارلاتے رہیں گے۔کیاآج کاشاعرنئے نئے استعاروں کی تخلیق نہیں کرسکتا کیاآج کے شاعروں کا تخیل جواب دے گیاہے؟اس ضمن میں سلیم اختر لکھتے ہیں:

آج کا یہ دور اپنے استعارہ کی تلاش میں ہے ایسا روشن استعارہ جو تخلیق کے سفر کے لیے راہنما ستارے کا کردار بھی ادا کر سکے اور عصری شعور کے لیے سمت نما بن سکے۔ آج کے تخلیق کار کو اپنی تخلیقی شخصیت میں اگر کسی طرح کی کمی' خامی' کجی' یا جھول کا احساس ہوتا ہے تو اسے استعارے کی توانائی کا احساس ہونا چاہیے ورنہ بصورت دیگر بنجر زمین معاشرہ کو تخلیقی قبرستان میں تبدیل کر دیں گے(۳۹)

نتائج:

ہر لفظ اپنے خاص معنی میں ظہور رکھتا ہے مثلاً اسد کہ جسے چیڑ پھاڑ کرنے والا درندہ یعنی شیر کے لیے وضع کیا گیا ہے، اب اسد کو حرف تشبیہ کے ساتھ اپنے سے غیر کے معنی میں استعمال کرے تو یہ تشبیہ ہے اور اگر جہاں حرف تشبیہ مذکور نہ ہو اور لفظ حقیقی معنی سے آگے جا کر مجاز کی حدوں کو چھو جائے اور قرینہ سے معنی کا تعین ہو جائے اسے استعارہ کہیں گے

جس طرح تشبیہ، مجاز مرسل، کنایہ جیسے علم بیان کی اصطلاحیں عربی شعر و ادب کی شعریات سے اردو میں تنقیدی اصطلاح بن چکی ہیں اسی نہج پر بلکہ ان سے وسیع پیمانے پر استعارہ بھی اپنی چاشنی اور معنی آفرینی کے ساتھ اردو ادب و تنقید میں در آیا ہے۔ اسعارہ صرف ایک لفظ نہیں بلکہ محاورہ، ضرب المثل، پہیلی، ایک مصرعہ، ایک شعر اور مکمل نظم بھی استعارہ بن سکتی ہے۔ استعارے کے ساتھ ساتھ ایک اور اصطلاح "علامت" کی آئی ہے جسے جدیدیت کے بعد مغرب سے در آمد کیا ہے راقم الحروف کے نزدیک لطیف فرق کے ساتھ یہ دونوں آپس میں بہن بھائی کا رشتہ رکھتے ہیں اصل دونوں کا ایک ہیں البتہ کچھ صفات میں ایک دوسرے سے فرق بھی رکھتے ہیں۔

آج کل کچھ علائم اوراستعارے ایسے استعمال کیے جا رہے ہیں جب پر ابہامات کی کئی پرتیں جمی ہوئی ہیں اب ان کی تفہیم کیسے کی جائیں؟ ویسے بھی شاعری کی اپنی زبان اور لفظیات ہوتے ہیں جن کی تفہیم لغات سے نہیں' بلکہ

شاعر کی شخصیت، فضا، ماحول، اور تہذیب و ثقافت کے پس منظر میں شاعری کی تفہیم کی جا سکتی ہے۔ علاوہ ازیں اگر ایک شاعر کو سمجھنا چاہیے تو اس کی شاعری میں موجود وسائل شعری تشبیہ، تلمیح، مجاز مرسل، کنایہ اور خاص کر استعارہ کی تفہیم کریں'استعارہ کے بطن میں شاعر اور اس کی شخصیت چھپی ہوتی ہے اور شاعر کے اندر سے اس کا عہد بول رہا ہوتا ہے پس ہم کہہ سکتے ہیں کہ شاعری میں موجود استعاروں سے شاعر اور شاعر سے اس کے عہد کی تفہیم ہو سکتی ہے۔

ہر عہد کے اپنے استعارے ہوتے ہیں جنہیں انتہائی خلاقانہ ذہنیت کے حامل شعراء ہی تخلیق کر سکتے ہیں۔ البتہ پرانی بوتلوں میں نئی شراب بھی پیش کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ جب تک شاعر اپنے عہد سے نیا استعارہ نہیں اٹھائے گا شعر میں جان نہیں آئے گی۔ کیونکہ شاعری میں جان استعارہ کی بدولت آتی ہے اور یہ تب آئے گی کہ جب شاعر نیا اور عصری استعارہ تلاش کریں۔ یہ بات کہی جا سکتی ہے آج کی شاعری اپنے عہد کے استعارے کی تلاش میں ہے۔'اب دیکھیئے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں

حوالہ جات

۱۔ اردو لغت (تاریخی اصولوں پر) جلد اول، ترقی اردو بورڈ، کراچی، ص ۲۵۲

۲۔ درسی اردو لغت، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، اسلام آباد، طبع دوم، ۲۰۰۴، ص ۳۱

۳۔ سید احمد دہلوی، مولوی، فرہنگ آصفیہ جلد اول، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ص ۱۷۰، دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۷

۴۔ شان الحق حقی، فرہنگ تلفظ، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، اسلام آباد، ص ۴۳، طبع چہارم ۲۰۱۲

۵۔ مہذب لکھنوی، مہذب الغات جلد اول، لکھنؤ، طبع سوم ۱۹۷۸،

۶۔ مولانا محمد حنیف گنگوہی، نیل الامانی، مختصر العانی شرح اردو، دارالاشاعت، کراچی، ۲۴۶، ۲۴۵، طبع اول ۲۰۰۵

۷۔ احمد ہاشمی، جواہر البلاغہ، حوزہ علمیہ قم، پہلا ایڈیشن ۱۹۹۰ ، ص ۲۱۸

۸۔ روحینہ جعفری، کلامِ اقبال میں آگ کا استعارہ، اورنٹیل کالج پنجاب یونیورسٹی، لاہور، سیشن ۱۹۹۳، ۱۹۹۱، ص ۵

۹۔ A.S.Horn, Oxford Advanced Learner's Dictionary(10th Edition),Oxford University Press,2020,page 987

۱۰۔ سید عابد علی عابد، البیان، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳، ص ۱۹۶

۱۱۔ عبدالرحمٰن بجنوری، مرآۃ الشعرا، آفتاب عالم پریس، لاہور، ۱۹۲۶ئ، ص ۲۴۴

۱۲۔ محمد حسن عسکری، مجموعہ حسن عسکری، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۰ئ، ص ۱۹۶

۱۳۔ انیس ناگی، شعری لسانیات، کتابیات، لاہور، طبع اول، مارچ ۱۹۶۹ئ، ص ۱۴، ص ۴۲

۱۴۔ شمس الرحمٰن فاروقی، شعر و شور انگیز (جلد اول)، اظہار سنز، لاہور، ۵ جنوری ۲۰۱۳ئ، ص ۲۱۴

۱۵۔ گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، سانحہ کربلا بطور شعری استعارہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ئ، ص ۱۱، ص ۱۲

۱۶۔ مولانا شبلی نعمانی، شعر العجم، جلد چہارم، نیشنل بک فاؤنڈیشن، پاکستان،، اسلام آباد، ص ۴۷، ۴۶

۱۷۔ مجموعہ محمد عسکری، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۰ئ، ص ۱۹۶

۱۸۔ انیس ناگی، شعری لسانیات، کتابیات، لاہور، طبع اول، مارچ ۱۹۶۹ئ، ص ۲۵

۱۹۔ بشیر بدر، آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی جائزہ، انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی ۱۹۸۱ئ، ص ۳۰۷

۲۰۔ تحقیقات اردو (جرنل)، جلد ۱، شمارہ ۱، عابد سیال، جنوری، جون، ۲۰۱۱ئ، ص ۲۲

۲۱۔ یوسف حسین، ڈاکٹر، اردو غزل، القمر انٹر پرائزرز، لاہور، طبع اول، س ن، ص ۱۲۹

۲۲۔ سید عابد علی عابد، پروفیسر، اصول انتقاد ادبیات، طبع دوم، مجلس ترقی ادب، لاہور، مئی ۱۹۶۶، ص ۲۲۵، ۲۲۴

۲۳۔ محمد حسن عسکری، مجموعہ محمد عسکری، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۰ئ، ص ۱۹۹

۲۴۔hecupdates.com۔۲۶/۷/۱۰:۱۰،۲۰۲۵

۲۵۔شان الحق حقی، نکتہ راز،، منتخب مضامین، عصری کتب، کراچی، اشاعت اول فروری ۱۹۷۲ئ، ص۱۳۲،۱۲۹

۲۶۔یوسف حسین خان،ڈاکٹر، اردو غزل، آئینہ ادب،لاہور، ۱۹۶۲، ص۱۸۳

۲۷۔جابر علی سید، جدید شعری تنقید،بیکن بکس گلگشت ملتان، ۲۰۱۲، ص۶

۲۸۔شمس الرحمن فاروقی، کتاب تنقیدی افکار، قومی کونسل برائے فروغِ اردو، نئی دہلی، جنوری ۲۰۰۴، ص۲۱۱

۲۹۔شمس الرحمن فاروقی، کتاب تنقیدی افکار، قومی کونسل برائے فروغِ اردو، نئی دہلی، جنوری ۲۰۰۴، ص۲۱۲

۳۰۔بازیافت ۲،،ضیاالحسن،ڈاکٹر، مشمولہ، غزل اور غزل کی تنقید، اور نٹیل کالج پنجاب یونیورسٹی،لاہور، ۲۰۰۳، ص۲۱۳

۳۱۔جدید شعری تنقید، جابر علی سید، بیکن بکس، گلگشت ملتان، ۲۰۱۲ئ،۸۵

۳۲۔ عابد حسین سیال،ڈاکٹر،اردوغزل پر بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں کے اثرات،مقالہ پی ایچ ڈی، نمل اسلام آباد،۲۰۱۲، ص۳۵

۳۳۔حامد کاشمیری،ڈاکٹر، غزل میں "جدیدیت کے شعراء"، مشمولہ "اردو غزل" مرتبہ:کامل قریشی،ڈاکٹر، ص۳۴۵

۳۴۔سید وقار افضل،مقالہ ایم فل،جدید اردو غزل میں تشبیہات و استعارات کا جائزہ،شعبہ اردو جی سی یونیورسٹی ،لاہور،۲۰۰۶، ۲۰۰۴، ص۴۴

۳۵۔انیس ناگی "تنقید شعر "،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۱۹۸۷ص۸۸،۸۷

۳۶۔اردو میں علم بیان اور بدیع کے مباحث، مزمل حسین،ڈاکٹر، مجلس ترقی ادب،لاہور، اشاعت اول ۲۰۱۰ئ، ص۲۹۶

۳۷۔بازیافت ۲،،ضیاالحسن،ڈاکٹر، مشمولہ، غزل اور غزل کی تنقید، اور نٹیل کالج پنجاب یونیورسٹی،لاہور، ۲۰۰۳، ص۲۱۳

۳۸۔بشیر بدر، آزادی کے بعد کی غزل کا جائزہ، انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی،۱۹۸۱، ص۳۰۷

۳۹۔ سلیم اختر،ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور، انتسواں ایڈیشن ۲۰۰۹ئ، ص۶۳۴